خضر راہ برصغیر کی ادبیات میں نغمہ انقلاب کی پہلی آواز

تنویر احمد

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی

تلخیص: اقبال غزل اور نظم دونوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظموں میں طویل اور مختصر دونوں نوع کی نظمیں لکھیں ہیں، ان کی شاہکار اور طویل نظموں میں خضر راہ کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ خضر راہ ایسے پر آشوب ماحول میں ایک نئی تعمیری اور روشن صبح کی نوید سناتی ہے جب پوری امت مسلمہ روبہ زوال تھی، خصوصا سلطنت عثمانیہ جہاں کبھی سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا، انتشار و تقسیم کی زد میں خود غروب ہو رہی تھی، مسلمان قوم انتہائی مصائب و آلام سے دوچار تھی، نااتفاقی اور آپسی خانہ جنگی عروج پر تھی، عیسائیوں اور یہودیوں کی سازشوں نے آزادی اور اختیار کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا۔ عربوں کی عین وقت پر ترکوں کے ساتھ غداری نے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ ساتھ پوری امت مسلمہ کو شکست و ریخت کے دلدل میں ڈال دیا تھا، ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی۔ دوسرا اہم تاریخی واقعہ جو اس نظم کا پس منظر بنا وہ تھا انقلاب روس، در حقیقت اس نظم کا پس منظر انیس سو سترہ کا انقلاب روس ہے اور غالباً ہندوستانی ادبیات میں انقلاب روس کے استقبال میں یہ پہلی نظم ہے۔ اس زمانے میں اس نظم نے امید کی نئی صبح کے ساتھ انسانی زندگی کو حوصلہ بخشتے ہوے تعمیر نو کا علم بلند کیا۔

کلیدی الفاظ: قندیل، قرآنی تلمیح، دگرگوں، کشتی مسکین، لالہ و گل، دلدل، کلیسا، پیہم گردش۔

اقبال کی شاعری ان کی فکری عظمتوں کے احسان سے بلند تر ہے فن جب اعلی خیالات سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو تخلیق کے لازوال شہ پارے وجود میں آتے ہیں فکر کی بلندی کے بغیر فن کی عظمتوں کا احساس ناممکن ہے فکر کی عظمت کے طفیل ہی نظم خضر راہ ہماری ادبیات کی تاریخ میں روشنی کی ایک قندیل ہے۔ یہ نظم جہاں بین الاقوامی مسائل سے تخلیق کو آشنا کرتی ہے وہیں ایک بڑے پیغام کی داعی بھی ہے۔ ناچیز کے

مطالعے میں بین الاقوامی محسوس کا ایسا کوئی اظہار اقبال سے پہلے ہماری ادبی تاریخ میں موضوع اظہار نہ بن سکا، ہماری ادبیات کا مرکزی موضوع فرد اور ملک کے مسائل تک محدود تھا جس میں تاریخ و تہذیب کے گزشتہ شب و روز بھی شامل تھے۔ لیکن اقبال اردو کے ہی نہیں برصغیر کے ایک محترم شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے کہ انہوں نے ملک سے الگ عالمی مسائل اور ان کے منظر نامے پر اظہار خیال کیا۔ یہ اردو ہی نہیں دوسری ادبیات کے لیے بھی قابل فخر تخلیق ہے اقبال نے یورپ میں تین سال قیام کیا، نظر میں وسعتوں کی ایک دنیا آباد ہوئی، یورپی تہذیب اور معاشرت کو قریب سے دیکھنے کا مشاہدہ ہوا۔ لیکن واپسی کے بعد ابھی برملا اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی اگرچہ چند نظموں میں بیرون ملک کے مسائل کا عکس و اظہار شروع ہو چکا تھا لیکن کوئی ایک مربوط نظم ایسی نظر سے نہیں گزرتی۔ اقبالنے یورپ میں رہتے ہوئے یورپ کے باشندوں کو آگاہ کیا تھا کہ تمہاری تہذیب خود اپنے ہی خنجر سے نابود ہو گی، لیکن یہ اشارات کافی نہیں تھے جو واشگاف طور پر خضر راہ میں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۱۷ میں انقلاب روس کا سانحہ پیش آیا جو صرف روس یا یورپ تک محدود نہ تھا، ساری دنیا اس کی زد میں تھی انسانی معاشرہ ایک نئے ضابطہ حیات سے آشنا ہوا، یوں کہہ لیجیے کہ دنیا ایک نئے نظریے سے دوچار ہوئی اور اس نظریے نے انسانی فکر و ذہن کو مضطرب کر کے فکر و شعور کا ایک آتش فشاں پیدا کیا۔ مغرب کا وہ بوسیدہ سیاسی نظام دگرگوں ہونے لگا۔ اس نظریے کی زد سے کرہ ارضی کا محفوظ رہنا مشکل تھا، اس کی بازگشت ہندوستان میں بھی سنی جانے لگی۔ مگر ابھی تخلیقی اظہار کی کوئی صورت سامنے نہیں آئی تھی۔ اقبال نے اس کشمکش کو محسوس کیا اور بڑی فراخ دلی سے اس پورے نظام معاشرت کا استقبال کیا، اسے آفتاب تازہ کہہ کر خوش آمدید کہا ہے جو زمین کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

اس استقبال سے اقبال کی فکری نسبت اور ان کے جذباتی جوش و خروش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس نظم کے تحت اقبال نے پورے اشتراکی نظام کی برکتوں کے ساتھ اس کی خامیوں کا تجزیہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نظم کی تخلیق کے لیے اقبال نے کلاسیکی اور قرآنی تلمیح سے پیکریت کے نقش ڈھالے ہیں، ہماری روایتی تاریخ میں حضرت خضر کا مقام ایک راز درون حیات کے آشنا کے طور پر معروف ہے۔ اقبال نے حضرت خضر کی علامت میں بہت ہی گہری معنویت کا مشاہدہ کیا ہے۔ جیسے وہ اسلامی فکر و عمل کے زندہ اور متحرک پیکر ہیں، دوسرے حضرت خضر حیات جاوداں کے مالک ہیں، تیسرے وہ چشمہ حیواں سے واقف ہیں، چوتھے وہ جہاں بینی کے اسرار و رموز سے آگاہی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک پوشیدہ اور پر اسرار زندگی کے مالک ہیں، ساتھ ہی بحر و بر پر ان کی نظر ہے اور اس کے علاوہ حضرت موسی کے وہ ہم سفر ہیں انہی وجوہات سے ہماری شعری روایت میں حضرت خضر کی تلمیح کا بہت ہی معنی خیز استعمال ہوا ہے۔

اقبال کی نظموں کا ایک تخلیقی حسن یہ بھی ہے وہ نظموں میں ایک تمثیلی حسن بیاں قلم بند کرتے ہیں جس میں افراد یا علامتیں متحرک نظر آتی ہیں جیسے انسانوں کے علاوہ پرندے، لالہ و گل، کوہ دریا اور کائنات کی بہت سی چیزیں اقبال کی شاعری میں علامت کے طور پر بولتی نظر آتی ہیں۔ اقبال نے اس پوری نظم میں حضرت خضر کو ایک بڑے فکر انگیز علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اشارات کی ایک دنیا آباد کی ہے۔ اسی لیے ان کو واقف اسرار کہا ہے۔ جہاں بین اور جہاں شناس بھی اقبال تسلیم کرتے ہیں اور حضرت موسی کے ساتھ ان کے سفر کی پوری داستان کو اقبال اس نظم میں بیان کرتے ہیں، کشتی مسکین جان پاک اور دیوار یتیم کہہ کر قرآن میں بیان کردہ وہ سارے واقعات بڑی خوبصورتی اور اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ یہ اقبال کی قصہ گوئی کی ایک بڑی پہچان ہے۔

نظم کے ابتدائی بند میں ایک حسین لیکن بہت ہی معنی خیز منظر پیش کیا گیا ہے بلکہ اس نظم کا سب سے خوبصورت حصہ پہلا بند ہے، جس کی آغوش سے حضرت خضر کی تصویر ابھرتی ہے، اس بند میں جہاں عرب کی سرزمین، سمندری سرگوشیاں، اور ریگستان کی صحرائی صورت گری کا بیان کرکے اقبال نے محاکات یا منظر نگاری کا اعلی ترین نمونہ پیش کیا ہے۔ پہلے شعر میں نرم رو دریا کا ذکر بڑا معنی خیز ہے اور دل میں ایک ہلچل کی کیفیت کا بیان بھی بہت

کلام ہوتے ہیں اور عالمی مسائل اور انقلاب سے متعلق اپنے قلب و نظر کی تسکین کے لیے ساتھ ہی قارئین کو آگاہی بخشنے کے لیے سوالات کرتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب حضرت خضر سے حاصل کرتے ہیں اور اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں گویا خضر کی علامت سے اقبال نے اپنے دل کی تمام باتیں کہہ دی اور مشاہدات کی تمام کیفیات کو قارئین کے روبرو ایک شعری الہام کے طور پر پیش کر دیا ہے یہ نظم اردو کے تخلیقی سرمائے کا ایک گراں بہا آغاز ہے جس سے نظم گوئی کی روایتوں کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔

اقبال غزل اور نظم دونوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظموں میں طویل اور مختصر دونوں نوع کی نظمیں لکھیں ہیں، ان کی شاہکار اور طویل نظموں میں خضر راہ کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ خضر راہ ایسے پر آشوب ماحول میں ایک نئ تعمیری اور روشن صبح کی نوید سناتی ہے جب پوری امت مسلمہ روبہ زوال تھی، خصوصا سلطنت عثمانیہ جہاں کبھی سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا، انتشار و تقسیم کی زد میں خود غروب ہو رہی تھی، مسلمان قوم انتہائی مصائب و آلام سے دوچار تھی، نا اتفاقی اور آپسی خانہ جنگی عروج پر تھی، عیسائیوں اور یہودیوں کی سازشوں نے آزادی اور اختیار کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا۔ عربوں کی عین وقت پر ترکوں کے ساتھ غداری نے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ ساتھ پوری امت مسلمہ کو شکست وریخت کے دلدل میں ڈال دیا تھا، ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی۔ دوسرا اہم تاریخی واقعہ جو اس نظم کا پس منظر بنا وہ تھا انقلاب روس، در حقیقت اس نظم کا پس منظر انیس سو سترہ کا

انقلاب روس ہے اور غالباً ہندوستانی ادبیات میں انقلاب روس کے استقبال میں یہ پہلی نظم ہے۔اس زمانے میں اس نظم نے امید کی نئی صبح کے ساتھ انسانی زندگی کو حوصلہ بخشتے ہوے تعمیر نو کا علم بلند کیا۔

نظم خضر راہ کل گیارہ بندوں پر مشتمل ہے اور کلام اقبال کے مجموعہ اول "بانگ درا" میں شامل ہے۔اس نظم میں دو اہم کردار ہیں، یایوں کہہ لیجئے کہ اس نظم میں اقبال دو حصوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ایک شاعر اقبال اور دوسرا مفکر اقبال، نظم خضر راہ میں اقبال شاعر اور خضر کے درمیان ایک مکالمہ قائم کرتے ہیں، جس میں شاعر، خضر سے ان کی مسلسل صحرا نوردی، راز زندگی، سلطنت، سرمایہ کاری اور اسلام کے حوالے سے چند سوال کرتا ہے۔اقبال بزبان خضر فکری حوالوں کے ساتھ ہر ایک سوال کا تسلی بخش جواب دیتے ہیں۔پوری نظم اقبال کے فلسفہ و فکر کی ترجمان ہے۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ شاعر انتہائی پریشانی اور ذہنی کشمکش کی حالت میں سکون کی جستجو میں ساحل دریا کی جانب رخ کرتا ہے۔شاعر کو ایک ایسی صبح کی تلاش ہے، جہاں زندگی بامعنی ہو جہاں اس کا وطن عزیز فرنگی جال سے آزاد ہو۔جہاں عالم اسلام یورپی فتنہ وفساد سے محفوظ ہو۔ نظم کے اس پہلے بند میں منظر کشی کا بہترین نمونہ ملتا ہے۔جو ایک خاص کردار خضر کے ظہور کے لیے ہے۔یہاں ایک سکوت کی فضاء ملتی ہے یہ دراصل اس انسانی ماحول کے جمود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس کو توڑنے کے لیے ہی شاعر کا دل ایک اضطرابی کیفیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ نظم کے چھٹے شعر میں ہی خضر کی شخصیت منظر پر ابھر آتی ہے، خضر شاعر کو تجسس میں دیکھ کر کہتے ہیں کہ اگر چشم و دل وا ہو یعنی انسان کی روح بیدار ہو تو دل کے اندر وہ روشنی اور نور پیدا ہو جاتا ہے کہ جو ظاہری حیات کے ساتھ ساتھ کائنات کے پوشیدہ حقائق کے مشاہدے کی صلاحیت رکھتا ہے۔یعنی بیدار دل ہی انسان کے لیے آگاہی اور رازشناسی کے دروازے کھولتا ہے

۔کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل

چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

دوسرے بند کا آغاز اقبال "خضر" کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کرتے ہیں اور یہاں شاعر خضر سے کہہ رہا ہے کہ کائنات کے تمام سربستہ راز آپ پر منکشف ہیں اور آپ مستقبل کے ان حالات و واقعات سے بھی بخوبی واقف ہیں جو مستقبل میں ظہور پزیر ہونے ہیں۔ اقبال خضر کو موسیٰ کے مقابلے میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موسی کا علم بھی آپ کے سامنے کم ہے،اس کے بعد اقبال خضر کے حضور اپنے سوالات قائم کرتے ہیں کیونکہ سوال اُسی سے پوچھے جاتے ہیں جو صاحبِ علم و صاحب اسرار ہو۔اقبال پوچھتے ہیں کہ آپ کو صحرا نوردی سے اتنی دلچسپی کیوں

ہے، زندگی کا اصلی راز و حقیقت کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے، سرمایہ داروں اور مزدور طبقہ میں کشمکش کیوں ہے، دنیائے اسلام کی زبوں حالی کی وجہ کیا ہے۔

اس کے بعد خضر پہلے سوال کا جواب دیتے ہیں کہ جہد مسلسل، حرکت و عمل ہی حقیقی زندگی ہے۔ اقبال یہاں بزبان خضر امت کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اصلی زندگی وہی ہے جس میں انسان اپنے مقاصد کے حصول میں ہمیشہ سرگرداں رہے۔ اقبال کے نزدیک جو انسان، جو قوم مسلسل جدوجہد کرتی ہے وہ آباد و کامیاب رہتی ہے اور اگر وہ تھک کر بیٹھ جائیں تو موت ان کی منتظر ہوتی ہے۔ یہاں صحرانوردی جہد مسلسل کا استعارہ ہے جو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ بقائے دوام کا راز پیہم حرکت و عمل میں ہے۔ خضر اپنی مسلسل دوڑ دھوپ اور حرکت و عمل کو اصل زندگی بتاتے ہیں۔

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے

یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اگلے بندوں میں زندگی کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اقبال انسان کو بتاتا ہے کہ زندگی سود و زیاں، زماں و مکاں اور نفع و نقصان کی قید سے بلند تر چیز ہے۔ زندگی تمام تر زنجیروں سے آزاد ایک احساس اور جذبے کا نام ہے۔ اس میں کبھی حصول مقصد کے لیے جان قربان بھی کرنی پڑتی ہے۔ انسانی زندگی آج اور کل، ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں پیمائش کا نام نہیں۔ اس میں تجدید خودی کی قوت پوشیدہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور ان سے بھرپور کام لے، کیونکہ اسی لیے تو انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ زندگی اور آزادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان میں بے شمار فکر و قوت کے خزانے موجود ہیں۔ مگر اس کے اظہار کے لیے آزادی اولین شرط ہے۔ کیونکہ غلامی انسان کی قوت و فکر کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور نمو و فروغ کے سارے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن آزاد زندگی ایک ایسے سمندر کا روپ اختیار کر لیتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب

اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی!

آگے چل کر اقبال انسانی زندگی میں ذوقِ عمل اور جہد مسلسل کو ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں اُن کے خیال میں انسان کو سچائی اور صداقت کا پیکر ہونا چاہیے۔ اپنے دل میں ولولہ اور عزم و جوش پیدا کرنا چاہیے۔ جو مرتبے اور عہدے، مال و دولت انسان کو وراثت میں ملے ہیں۔ ان پر انحصار کرنا چھوڑ دے۔ اپنی ہمت، اپنی محنت اور اپنے خون پسینے کی کمائی سے دولت کمائے اور جاہ و مرتبہ حاصل کرے۔

چھٹا بند سلطنت سے متعلق ہے۔ سلطنت و حکومت کی طاقت کو اقبال پر فریب جادوگری کہتے ہیں۔ جہاں ایک طرف طاقتور حکمرانوں نے اپنی طاقت اور جارحیت کے بل بوتے انسانی سماج پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں، تو دوسری طرف مدبرانہ مصلحتوں اور رعایا پروری کے ظاہری سلوک کے لباس پہنے رکھے ہیں۔ جب کوئی محکوم نیند سے بیدار ہوتا ہے اور ملوکیت و شہنشاہیت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو حکمران اُسے عیاری سے پھر سلا دیتا ہے۔ اُسے ایسے سہانے سپنے دکھاتا ہے کہ وہ پھر سے غلامی کا طوق گلے میں پہن لیتا ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہاں اقبال آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے سخت تاکید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے انسان تو آزاد پیدا ہوا ہے۔ تیری مثال تو شاہین جیسی ہے تو اپنی آزاد فطرت کو غلامی کی دلدل میں پھنسا کر بدنام نہ کر اگر ایسا کرے گا تو خسارے میں رہے گا۔ علامہ کے مطابق جمہوریت ایک ایسا خونخوار جانور ہے جس کا ظاہر خوبصورت و رنگین ہے۔ لوگ اس کی ظاہری چمک کو دیکھ کر اس کو آزادی کا نظام سمجھ لیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں یہ بھی نظام ملوکیت ہی ہے۔ یہاں اقبال قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناداں انسان تو اس رنگ و بو کے دھوکے کو باغ سمجھ رہا ہے۔ اور اپنی نادانی سے اس پنجرے کو گھونسلا سمجھ رہا ہے جبکہ حقیقت میں یہ تجھ کو ہمیشہ ہمیش غلام رکھنے کی تدبیریں ہیں۔

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

بعد کے بند سرمایہ داری سے متعلق ہیں۔ اقبال خضر کی زبانی مزدور طبقہ کو پیغام دیتے ہیں کہ یہ کائنات کے دل سے اٹھنے والی آواز ہے۔ یہ صرف میرا ذاتی پیغام نہیں بلکہ میری آواز میں زمانے کی آواز شامل ہے۔ ان سرمایہ داروں نے تجھ کو غلام رکھنے کے لیے مختلف طریقے ایجاد کیے ہیں۔ تجھے کبھی ذات پات کے جھگڑوں میں الجھایا گیا، کبھی قومیت کا سوال کھڑا کیا ہے۔ کبھی کلیسا کا فریب چلایا گیا۔ کبھی تہذیب کا جال بچھا کر عوام کو بے وقوف بنایا گیا۔ کبھی کالے گورے کی تمیز رکھی گئی۔ اور طرح طرح کے خواب دکھا کر فریبوں میں الجھا کر تیرا خون چوستے رہے اور افسوس تو انہی کے لیے لڑتا رہا اور ان کے لیے محنت کرتا رہا۔ یہاں اقبال مزدوروں کو بیدار کرتا ہے۔ اقبال مزدور طبقہ سے انقلابی آواز میں کہتے ہیں کہ سرمایہ

رہے ہیں۔ یہاں اقبال پوری دنیا کے مزدوروں کو انقلاب روس کا حوالہ دے رہے ہیں کہ جس طرح روس میں مزدور طبقہ نے تختہ زار پلٹ دیا ہے اور سرمایہ داری نظام کو ختم کیا ہے اسی طرح اب آپ سب کو سرمایہ داری کی زنجیروں کو کاٹ پھینکنا ہو گا۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

آخری تین بند دنیائے اسلام سے متعلق ہیں، یہاں اقبال نے اسلام کی ناگفتہ بہ صورتحال پر گفتگو کرنے کے بعد اپنے جذبات کی تسکین کے لیے امید و آس کی راہ نکالی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام اطوار و عادات اور میراث کو مسیحی دنیا نے اپنا لیا جس کے نتیجہ میں وہ سرفراز اور کامران ہو گئے اور مسلمان پستی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ یہاں اقبال واضح انداز میں عربوں کو آئینہ دکھاتے ہیں کہ آپ نے ترکوں کے ساتھ غداری کر کے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ جب تک آپ سب ایک تھے مضبوط تھے جدا ہوئے تو دشمنوں نے ایک ایک کر کے تباہ و برباد کیا۔ اقبال یہاں ترکوں کے جاہ و جمال اور وقار کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ترک جو کبھی جاہ و جلال کے مالک تھے۔ آج وہ پوری دنیا میں رسوا ہو گئے ہیں۔ تاج خلافت سے بھی محروم ہو چکے ہیں اور اس سب کی ایک وجہ مغرب کی عیاری اور سیاسی چالبازی ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کا ترکِ مذہب اور اسلامی شعار سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد اقبال خودی کا درس دیتے ہیں کہ اپنی حاجتوں، ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر دوسروں کے سامنے سر مت جھکاؤ۔ اپنی خودی کو قربان نہ کرو اور دوسروں کے آگے ہاتھ مت پھیلاؤ۔ اگر آپ دوسروں کی محتاجی کرو گے، تو اس سے آپ کی خودی کو ٹھیس پہنچے گی۔ اقبال مشرق کے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ آپ کے مصائب و آلام کا حل ملت اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق میں مضمر ہے۔

اگر یہ قوم چاہتی ہے کہ ذلت کے گھپ اندھیروں سے نکل آئے تو انھیں آپس میں باہمی ربط وضبط پیدا کرنا ہو گا۔ مگر افسوس ہم اس نکتے سے ابھی تک بے خبر ہیں۔ لہٰذا جب بھی ہم اس راز سے آگاہی حاصل کریں گے تو ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

بعد ازاں اقبال ایک نئی صبح کی امید کے ساتھ امت مسلمہ کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ بہت جلد شکست وریخت کی یہ تاریکیاں مٹ جائیں گی اور ایک نیا سورج طلوع ہو گا۔ اور جس طرح سے تاریخ میں اسلام کے روشن باب رہے ہیں اور انصاف وعدل کا بول بالا رہا ہے ٹھیک اسی طرح ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے یعنی بہت جلد تاریخ خود کو دوہرائے گی اور ایک بار پھر عدل وانصاف کا علم بلند ہو گا۔ اقبال کی یہ نظم قوم کے لیے ایک نئے تعمیری دور کی نوید تھی اور ہے۔

خود احتسابی ہے۔ اقبال کے یہاں خودی کی بحث میں بھی خود احتسابی کا پہلو نمایاں ہے، اسی لیے وہ حرکت وعمل کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہوے منزل مقصود کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ مذکورہ نظم میں بھی انھوں نے بزبان خضر یہ پیغام دیا ہے کہ زندگی کی کامیابی مسلسل حرکت وعمل اور جدوجہد میں ہی پوشیدہ ہے۔ دراصل اس نظم میں اقبال نے ان بے عمل انسانوں کو جو ہر چیز کے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے تقدیر کے منتظر رہتے ہیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کی معراج پیہم گردش میں ہے۔ اس نظم میں جو مضمون اقبال نے پیش کیا ہے وہ اقبال کی پوری فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ حرکت وعمل، خودی کی نگہبانی، معاشرہ کی فلاح کے ساتھ فرد وسماج کے مقاصد کے حصول کا پیغام اس نظم کا مرکزی نقطہ نور ہے۔ جو بیانیہ کی حیرت فروز مثال ہے۔ علامات واشارات سے معمور عظیم تخلیق اپنی فکری ترسیل اور حسن آفرینی میں یہ ابدیت کی تصویر ہے۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

☆☆☆